گھر کے اندر گھر کے باہر

ممتاز عرب خواتین کے انٹرویوز

بوثائنہ شعبان
ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

مشعل

گھر کے اندر
گھر کے باہر

بثینہ شعبان

ترجمہ:

شفقت تنویر مرزا

مشعل بکس

آر بی۔5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور54600، پاکستان

MashalBooks.org

Bouthaina Shaaban: Both Right and left Handed Arab womenTalk about their lives	بثینہ شعبان: گھر کے اندر گھر کے باہر
Copyringth C English 1988: Bouthaina Shaaban	کاپی رائٹ انگریزی 1988ء بثینہ شعبان
Copyringth C Urdu 1994: **Mashal Pakistan**	کاپی رائٹ اُردو 1994ء مشعل پاکستان
RB.Awami Compliex Usman Block New Garden Town Lahore Pakistan	آر بی۔5 عوامی کمپلیکس عثمان بلاک نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور، پاکستان
Translation: Shafqat Tanveer Mirza	ترجمہ: شفقت تنویر مرزا
Publisher: **MASHAL BOOKS**	پبلشرز: مشعل بکس

MashalBooks.org

عربی نام

عالمِ عرب کے مختلف علاقوں میں لہجے کے اختلاف کے باعث انسانوں اور مقامات کے ناموں کے ہجے اور تلفظ میں بڑا فرق ہے۔ بعض علاقوں میں فرانسیسی اثرات کے تحت ہجے اور تلفظ بالکل ہی مختلف ہوگئے ہیں۔ بعض کلاسیکی عربی نام بھی ہمارے لیے نئے ہیں۔ اس کتاب میں عربی ناموں کے صحیح تلفظ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ہم جناب سجاد رضوی کے شکرگزار ہیں کہ اس سلسلے میں اُنہوں نے ہماری مدد فرمائی۔

MashalBooks.org

فہرست

تعارف: عرب عورت کا انکار	7
شام .... سب حقوق حاصل مگر گھر میں کچھ نہیں	39
حقوق کی مکمل ضمانت .... مگر بیرون خانہ	39
مقبولہ شالاق	50
لبنان: برسرِ پیکار عورتیں	68
فلسطین	97
عورتوں کا طریق بقا	98
الجزائر: شریک جدوجہد	161
پس چہ باید کرد	226

MashalBooks.org

تعارف

عرب عورت کا انکار

1982 میں لندن میں قیام کے دوران مجھے یہ کتاب مرتب کرنے کا خیال آیا۔ وہ بہت لمبا اور تکلیف دہ زمانہ تھا ان دنوں اسرائیل لبنان پر حملہ آور ہوا تھا۔ ہر روز ٹیلی وژن کی سکرین بیروت میں ملبے سے نکالے جانے والی عورتوں اور بچوں کی مردہ اور نیم مردہ لاشوں سے داغدار ہوتی۔ اسی موسم گرما میں میرا پہلا حمل تھا اور جیسے جیسے بچہ میرے پیٹ میں حرکت کرتا میں ماں بننے کے خیال سے بہت جذباتی بھی ہو جاتی لیکن مستقبل کا دھڑ کا لگا رہتا۔ مجھے بیروت کی ماؤں، لبنان کے غم زدہ شہروں اور مہاجر کیمپوں کے بارے میں سوچتی جو اس جدوجہد میں شامل ہیں مگر اس کے خلاف خود مہم شروع بھی نہیں کرتیں۔

پھر ایک برس بعد میں نے دیکھا کہ لبنانی اور فلسطینی عورتوں نے اپنے آنسو پونچھ لیے، زخموں پر پٹیاں باندھ لیں اور بندوق اٹھا کر جوابی مجاہدانہ جدوجہد کا آغاز کر کے دنیا کو حیران کر دیا۔ مضمحل تابع فرمان قسم کی عرب عورت نے مخصوص بے حسی کا دامن چاک کر دیا۔ اب وہ تابع فرمان مائیں اور بیٹیاں نہیں رہی تھیں ایسی تابع فرمان عورتیں جن کا تقاضا متعدد عرب ممالک میں قانوناً کیا جاتا ہے۔ میں نے عہد کیا کہ میں اپنے لوگوں کے بارے میں کچھ جان پہچان پیدا کروں گی چنانچہ اس تحریک کے سبب ہی میں نے یہ کتاب لکھ ڈالی۔

میں الجزائر میں کام کر رہی تھی وہاں شام گئی (میں شام میں پیدا ہوئی تعلیم پائی اور پروان چڑھی اور ان دنوں وہیں رہتی ہوں) پھر لبنان گئی۔ میں نے ان سب جگہوں پر عورتوں سے انٹرویو کیے۔ شام اور لبنان میں مقیم فلسطینی عورتوں سے بھی ملی۔ میر مقصد یہ تھا کہ یہ عورتیں خود اپنی حالت زار لبوں پر لائیں، اپنی اپنے انداز میں سنائیں اور اگر ممکن ہو تو اپنے بہت ہی پوشیدہ رکھے گئے احساسات کا بھی اظہار کریں۔ میں توقع کرتی ہوں کہ اس طرح مجھے جو تجربہ حاصل ہوا۔ اس میں عرب اور یورپی عورتیں بھی حصہ دار بنیں گی اور خود ان جنگ آزما پیشہ ور، سیاستدان، کسان عورتیں اور شہیدوں کی باوفا بیویوں اور ماؤں کی آواز سن سکیں گی۔ ان انٹرویوز میں میں نے بہت

MashalBooks.org

ہی کم دخل دیا۔ میں خود کو ایک ایسا مائکروفون بنایا جس پر میرے مقررین بول سکیں اور پڑھنے والے طبقے نسل اور ثقافتی تفاوت کے باوجود سن سکیں۔ میں اس سارے عمل میں بڑی پر اعتماد رہی۔ جن عورتوں سے میں نے بات کی انہوں نے اپنے دل کھول کر رکھ دیئے۔ انہوں نے بے پناہ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ اپنا حال بیان کیا اور بعض اوقات ایسے راز ہائے سر بستہ بھی کہہ ڈالے جن کا ذکر اپنے عزیز ترین رشتہ دار سے بھی نہیں کریں گی۔

انہی خواتین کے اس حال احوال نے میرے اندر اپنی جنس کے لئے بے پناہ محبت اور تعریف بھر دی۔ میں نے عورتوں کو اپنے رویے اور ایمان کے اعتبار سے دلیر سپاہی، نڈر دانش ور، بے لچک ساتھی، محبت کرنے والی مائیں، اچھی دوست اور اکثر بے غرض اور پر خلوص پایا۔ اس صنف نازک کے پردے کے پیچھے میں نے اس جنس کو اعلیٰ اخلاقی اقدار، حوصلے اور روشن خیالی کا حامل پایا۔ مردوں کے ہاتھوں تراشی اس دنیا میں عورتوں کو اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے لئے یہ کرنا ہے کہ ہم عورتیں ایک دوسرے کی حقیقت سے آشنا ہوں ایک دوسرے کو جاننے کے مواقع پیدا کریں۔ اور یہ ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کا عمل یقیناً آفاقی ہے۔ یہ کتاب بھی اسی عمل کا حصہ ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب ایک معاشرتی مطالعہ یا تجزیہ نہیں ہے۔ اس میں اعداد وشمار سے کم ہی کام لیا گیا ہے۔ نہ ہی اس کے ذریعے عرب دنیا میں عورت کے سیاسی، سماجی اور تاریخی مقام کا تجزیہ کیا گیا ہے نہ اس کے ذریعے ان حکومتوں کی خوش کن سرکاری تصویر پیش کی گئی ہے جنہیں یہ دعویٰ ہے کہ وہ عورتوں کی آزادی کے لئے کوشاں ہیں۔ یہ ایک طرح سے ذاتی سی کتاب ہے ایک کوشش ہے تاریخ کے ایک جلتے ہوئے لمحے میں گرفتار عورتوں کیلئے وہ اپنے تجربات میں دوسروں کو بھی شریک کر سکیں۔

جن عورتوں کے انٹرویوز اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں ان کا تعلق چار مختلف قومی گروپوں سے ہے میں نے مختلف سماجی طبقات کی عورتوں کو بھی شامل کرنے کی کوشش کی ہے تاہم یہ انداز بھی سائنٹیفک نہیں ہے۔

میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ اس کتاب میں عورتوں نے جو جو خیالات ظاہر کئے ہیں وہ میری اپنی آرا کے مرہون منت نہیں ہیں یعنی ان پر میری سوچ کا سایہ نہیں۔ یہ صرف اور صرف ان کے اپنے افکار ہیں۔ لازم نہیں کہ ان میں میری رائے کی آمیزش ہو میں نے اپنے افکار اور حالات زندگی الگ سے بیان کر دیئے ہیں۔

عرب خاتون کا انکار

1968ء کا ذکر ہے یہ روشن صبح تھی، بچے دو دو تین تین کی ٹولیوں میں ایک لہر کی طرح میرے گاؤں سے علاقے کے واحد سیکنڈری سکول کی طرف جا رہے تھے۔ سکول ذرا آگے پولیس سٹیشن کے ساتھ دوسرے گاؤں کے شروع میں ہی واقع تھا۔ تعلیم مخلوط تھی۔ ہم نے اس وقت تک لڑکیوں اور لڑکوں کے الگ الگ سکولوں کے چونچلوں کا سنا تک نہ تھا۔ چند برس بعد جب ہم نے سنا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے الگ الگ سکول بھی ہوتے ہیں تب بھی ہمیں یہ مخلوط سکول ہی اچھا لگا۔

میرا اسکول میرے گھر سے تین میل کے فاصلے پر تھا اور مسلسل چھ برس کے خوبصورت عرصہ میں دن میں دو بار یہ فاصلہ میں اپنے قدموں سے ناپا کرتی تھی۔ گرمی ہو یا سردی، ٹھنڈی صبح ہو یا گرم دوپہر ہم پاپیادہ سکول آتے جاتے رہے اور اس احساس ممنونیت کے ساتھ کہ ہمارا اسکول اتنا قریب ہے۔ کچھ سکول بہت ہی دور تھے۔ ہم لڑکوں کے ساتھ مل کر علم حاصل کر رہی ہیں۔۔

سکول جاتے ہوئے ابھی پولیس سٹیشن کے پاس ہی پہنچی تھی کہ میں نے اپنے ہم جماعت عزیز کو گاؤں کے درمیان والی پہاڑی سے بڑا خوش خوش اترتے ہوئے دیکھا۔ وہ خون آلود خنجر لہرا رہا تھا اور وہ کہہ رہا تھا "میں نے اسے قتل کر کے خاندان کا ناموس بچا لیا ہے۔" وہ دو پولیس والوں کی طرف بڑھا جو تھانے کے باہر کھڑے تھے۔ خنجر ان کے سپرد کیا اور اونچی آواز میں، جو ارد گرد موجود ہر کسی کو سنائی دے سکتی تھی کہا میں نے اپنی بہن کو مار دیا ہے اور خود کو قانون کے سپرد کرنے آیا ہوں تا کہ مجھے انصاف مل سکے۔ پھر تینوں بڑے رسان سے باتیں کرتے تھانے کے اندر چلے گئے۔ وہ منظر میرے ذہن پر نقش ہو گیا، میں سکول چلی گئی۔ اس روز پہلا سبق ایک نوجوان استاد نے دیا جو عیسائی تھا۔ وہ جب کلاس روم میں آیا تو اس کے چہرے پر موت ایسی زردی تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ اپنے شاگردوں کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے میرے بالکل سامنے بیٹھی دو بہنوں سحر اور ثمر سے سوال کرنا شروع کر دیئے "اس نے کیسے قتل کیا؟ تمہارا باپ کہاں تھا کیا وہ چیخی چلائی تھی؟۔" رکتے رکتے لڑکیوں نے بتایا کہ وہ یمن کے ساتھ ایک ہی بستر میں سو رہی تھیں، یمن عزیز کی بہن تھی، جب وہ جاگی اس وقت تک یمن کو مار دیا گیا تھا بستر میں لہو کا ایک تالاب سا تھا۔

یمن سولہ سال کی تھی۔ ان دنوں بیروت کے کچھ کھاتے پیتے گھرانوں میں ہمارے گاؤں کی نوکرانیاں کام کرتی تھیں۔ گاؤں کے لوگوں نے ایسی لڑکیوں کو افسر کہنا شروع کر دیا تھا کیونکہ فوجی افسروں کی اچھی تنخواہیں ہوا کرتی تھیں۔ گاؤں کے کچھ ایسے خوش قسمت کنبے بھی تھے جن کی تین تین چار چار بیٹیاں بیروت میں ''افسر'' تھیں۔ ان کے والد سال میں ایک مرتبہ انہیں ملنے اور ان سے پیسے لینے جایا کرتے تھے۔ وہ واپسی پر بیروت کی حیران کن زندگی کے بارے میں بڑے فخر سے باتیں کرتے۔ شاید پہلی مرتبہ یہ بھی ہوا کہ باپ بیٹی کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کرتے کیونکہ ہر نومولود لڑکی کا مطلب یہ ہوتا کہ اس سے ہر سال ایک ہزار لبنانی لیرا کی آمدنی ہوگی۔ جب لڑکیاں بالغ ہو جاتیں تو انہیں واپس لایا جاتا اور پھر وہ اپنے اپنے دلہا کا انتظار کرتیں۔

یمن کا باپ مر چکا تھا پس ماندگان میں تین بڑے بھائی اور ماں تھی۔ یمن خود سات سال کی تھی۔ آمدنی کا ذریعہ کوئی نہیں تھا چنانچہ تینوں بھائی یمن کو بیروت بھیجنے پر راضی ہو گئے تا کہ اس کی کمائی سے وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ یمن جب پندرہ برس کی ہوئی تو اسے واپس گاؤں لایا گیا۔ اس وقت تک اس کے بڑے بھائی اے لیول تک پڑھ چکے تھے اور تیسرے بھائی عزیز کا ایک سال باقی تھا۔ جب یمن گاؤں آئی، وہ منظر مجھے آج بھی یاد ہے۔ اس نے نیلا سکرٹ اور سفید بلاوز پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں گول سا ریڈیو تھا۔ بال نیلے ربن میں بندھے تھے اور آنکھیں دھوپ والی نیلی عینک کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔ دیہاتی معیار کے مطابق وہ بے انتہا سمارٹ لڑکی تھی۔ جو لڑکیاں اسے ملنے گئیں ان کی اکثریت اس کے چست لباس اور شہری لب و لہجہ سے رشک کی حد تک متاثر تھیں۔ یہ تھے یمن کے بارے میں لڑکیوں کے تاثرات۔ مجھے یہ علم کہ لڑکیوں کی اس کے بارے میں کیا رائے تھی۔ ممکن ہے کچھ گھاگ قسم کے لڑکوں نے اسے آسان شکار بھی سمجھا ہو۔

یمن کے آنے کے چند ماہ بعد ہی اندرخانے یہ باتیں شروع ہو گئیں کہ وہ حاملہ ہے۔ یمن کی چچی اور ماں اسے کرائے کی ایک موٹر سائیکل پر نواحی قصبہ سلامیہ لے گئیں جہاں کے ڈاکٹر نے تصدیق کر دی کہ یمن حمل سے ہے۔ اس کی ماں ڈر گئی کہ اگر وہ اسے واپس لائی تو بیٹے قتل کر دیں گے چنانچہ یمن کو لے کر ایک دوسرے گاؤں کے المختار (گاؤں کا چودھری یا سربراہ) کے پاس لے گئی کہ وہ لڑکی کو بھائیوں سے بچائے۔ ہماری عربی روایات کے مطابق اگر کوئی کسی کے گھر میں داخل ہو کر امان مانگتا ہے تو اسے امان دی جاتی ہے۔ تحفظ فراہم کیا جاتا ہے اسی روائت

کے مطابق امان پانے والے الدخیل کے گھر کے اندر تحفظ کے دوران میزبان اپنی جان کی قربانی بھی دے سکتا ہے ۔ المختار نے یمن کو اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ کر دیا اور وہ اس کی ہر اعتبار سے حفاظت کر رہا تھا تا آنکہ ایک رات چاندنی میں عزیز دیوار پھلانگ کر اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں یمن دوسری دو لڑکیوں کے ساتھ سو رہی تھی ۔ تیز دھا خنجر سے اس نے یمن کا گلا کاٹ دیا۔ اکثر مجرم تو ایسی واردات کرنے کے بعد کوئی نشان تک چھوڑ کر نہیں جاتے ، اس کے برعکس عزیز نے گرم اور معصوم خون میں اپنے ہاتھ ڈبوئے اور پھر اپنی عزت پر لگے داغ دھوڈالنے کے کامیاب عمل کا سر عام اعلان کرنے کی خاطر فاتحانہ انداز میں باہر آ گیا۔

عزت و ناموس گنوانے والے جب مارے جاتے ہیں تو ان کی لاشوں کے کفن دفن کی اجازت نہیں ہوتی ۔ ان کی لاشوں کے لئے قسم کے احترام سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ ان کے فعل پر پردہ ڈالنے کی یا درگذر کی کوشش کی جا رہی ہے ۔ چنانچہ المختار کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ گاؤں کے بچوں کو بلاتا اور ان سے کہتا کہ وہ لاش گاؤں کے دوسرے سرے پر واقع قبرستان میں لے جائیں ۔ بچے یمن کی لاش کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہے تھے۔ اس کے حاملہ پیٹ پر پتھر مار رہے تھے اور اس پر تھوکتے جاتے تھے۔ ہم نے سکول سے واپسی پر دیکھا کہ قبرستان میں اس کی ننگی لاش ابھی تک پڑی ہے جیسے کوئی مردہ بھیڑ ہو۔ ہم میں سے کسی نے اس سے ہمدردی کا ذرا سا بھی اظہار کرنے کی جرات نہیں کی ۔ البتہ اگلے روز اکثر لڑکیاں سکول نہیں گئیں وہ اس المناک منظر کو دوبارہ نہیں دیکھا چاہتی تھیں ۔ دو دن بعد پتہ چلا کہ یمن کی لاش کو یا تو درندے لے گئے ہیں یا کسی نے رحم کھا کر رات کی تاریکی میں اسے دفن کر دیا ہے ۔ دفن کرنے والے نے ایسا وقت منتخب کیا جب اسے کوئی دیکھ نہ سکے ۔

عزیز کو صرف چھ ماہ کی قید ہوئی ۔ مزید ستم یہ ہوا کہ وہ جیل سے ایک ہیرو کے سے انداز میں برآمد ہوا اور گاؤں کے معتبر افراد میں شمار ہونے لگا ۔ کچھ عرصہ بعد وہ پیسے کمانے خلیج کے مما لک چلا گیا۔ واپس آ کر اس نے گاؤں میں بیکری کھول لی او گاؤں والوں کو اپنے ان ہاتھوں کی پکی روٹی کھلانی شروع کر دی جن سے اس نے اپنی بہن کا گلا کاٹا تھا اور جو اسکے خون میں ڈبوئے گئے تھے ۔

اس خوفناک واقعہ کے بعد میں نے امتحان (بکالارٹ) پاس کر لیا اور مجھے یونیورسٹی میں تعلیم جاری رکھنے کے لئے وظیفہ بھی دیا گیا۔ میں اس گاؤں کی پہلی لڑکی تھی جو دمشق کی یونیورسٹی

MashalBooks.org

میں پڑھنے کے لئے بغیر کسی مرد رشتہ دار کی ہمراہی کے، گاؤں سے چلی تھی۔ میرے جانے کے بارے میں نہ گھر پر اور نہ ہی گاؤں میں کوئی اعتراض اٹھا اسکے برعکس لوگ میری کارکردگی اور مزید تعلیم حاصل کرنے کے ارادے کی بڑے فخر کے ساتھ تعریف کرتے۔

صدر اسد 1970ء میں برسر اقتدار آئے۔ ان کے آنے کے بعد قومی ترقی کے لئے ترقی پسندانہ پالیسیاں شروع کی گئیں اور تعلیم کے شعبہ میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی۔ ہر کہیں سکول تعمیر کئے گئے اور چھوٹے سے چھوٹے اور انتہائی دور افتادہ دیہات میں بھی مفت تعلیم کا انتظام کر دیا گیا۔ بہت سے لوگوں کے لئے روزگار، اعلیٰ ملازمتوں، اور دیہات سماجی اور سیاسی عہدوں کے حصول کے لئے تعلیم ایک کلید ثابت ہوئی۔ جب میں نے بی اے کیا تو مجھے برطانیہ میں مزید پڑھائی کے لئے وظیفہ دیا گیا۔ میں ان معدودے چند شامی خواتین میں سے تھی جو دنیا کے مختلف حصوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے ملک سے نکلی تھیں۔

یہ ایک انہونی سی بات تھی۔ ہمیں ساتھیوں دوستوں اور عزیزوں نے بڑا حوصلہ بھی دیا اور امداد بھی۔ یہ 1976 کی بات ہے۔ ایک سال سے بھی کم عرصہ میں میں نے واروک یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور پی ایچ ڈی کرنے کیلئے نام لکھوا دیا۔ واروک میں ہی ایک عراقی سے واقفیت ہوئی جو فزکس میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ ہم دونوں عربوں کی تنظیم میں کام کرتے تھے۔ چنانچہ بہت اچھی مفاہمت سی ہوگئی جب ہم نے شادی کرنے کا ارادہ کر لیا تو میں نے ضروری جانا کہ اپنے والد سے مشورہ کرلوں۔ انہوں نے مجھے بیرون ملک سفر پر جانے کی اجازت دی تھی اور شادی کی اجازت دینا ان کی سماجی ذمہ داری تھی۔ تاہم میں نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ میں برطانیہ میں شادی کر رہی ہوں کیونکہ یہ اسی قسم کا جرم تصور ہوتا جو یمن سے سرزد ہوا تھا۔ میرے والد کو میری اسی خودسری پر بڑا تعجب ہوا اور انہوں نے خطوں کے ذریعے اس معاملے پر فیصلہ دینے سے انکار کرتے ہوئے ہم دونوں کو شام بلایا۔ ہم مان گئے۔ اس ملاقات کے بعد 1979ء کی گرمیوں پھر 1980ء اور پھر 1981ء کی گرمیوں تک میرے خاندان اور میرے درمیان خاندان کے حقوق وفرائض اور ذاتی حقوق کے مسئلے پر گرما گرم بحث مباحثہ جاری رہا۔ جس شخص کو میں نے منتخب کیا تھا اس سے ملاقات کے بعد خاندان نے مجھے بہت مجبور کیا کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی قومیت بھی مختلف تھی اور دین بھی۔ مگر یہ دو تو ظاہری وجوہ تھیں ان کے درپردہ زیادہ سنگین اور سنجیدہ امور تھے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ میں پہلی عورت تھی جس نے باپ اور بھائیوں کی

MashalBooks.org

اشیرواد سے آزاد ہوکر اپنے خاوند کا انتخاب کیا تھا۔ میرے والد بار بار یہ کہتے کہ گاؤں والے کیا کہیں گے کہ بیٹی اپنے خاوند کو ساتھ لے کر آئی اور اس کے دباؤ میں آ کر بزدل باپ نے بیٹی کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ میرے تمام بڑے بھائیوں نے اپنی اپنی مرضی سے بیاہ رچائے تھے اور ان موقعوں پر باپ کو بھی بلایا تھا مگر یہ بھائی ایسا ہی حق مجھے دینے سے انکاری تھے محض اس لئے کہ وہ مرد تھے اور میں عورت۔ میں نے ان کی خواہش کو مسترد کر دیا۔ ہر چند میرے چھوٹے بھائیوں اور بہنوں نے میرے حمائت کی مگر تمام مباحث اور پرجوش دلائل دو متضاد اور مختلف نقطہ نظر۔۔۔مردانہ اور زنانہ۔۔۔کو قریب نہ لا سکے۔ آخر کار میرے والد نے مجھے الٹی میٹم دے دیا کہ یا تو میں اپنے انتخاب کو ترک کر دوں یا گھر چھوڑ دوں اور کبھی والدین کو منہ نہ دکھاؤں۔ مجھے ایسے فیصلے کرنے سے سخت نفرت ہے مگر مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ حاصل کلام یہ کہ میں نے گھر والوں کو خدا حافظ کہا اور میں اور میرا شوہر حمس چلے گئے جہاں ایک سادہ سول انداز میں ہم نے شادی کر لی۔ یہ **1981** کے شروع موسم گرما کی بات ہے تب سے اب تک میری گھر والوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ یمن کے قتل کے دس سال کے اندر اندر فضا ایسی تبدیل ہوئی تھی کہ میرے باپ اور بڑے بھائی من مرضی کی زندگی گذارنے سے روکنے کے لئے مجھ پر جسمانی تشدد کرنے کا سوچ تک نہ سکے۔ وہ مجھ پر زیادہ سے زیادہ اخلاقی اور نفساتی دباؤ ڈال سکتے تھے مگر وہ بھی کارگر نہ ہوا۔ مزید یہ کہ میں نئی نسل کے لئے ایک مثالی راہ نما بن گئی جس کی قربانی کا ثمر نئی نسل کو نصیب ہوا مثلاً میری ایک چھوٹی بہن نے صرف اپنی پسند کے مرد کا نام بتایا اور والد تنے اسے دعائیں بھی دیں اور اچھے اچھے تحفے بھی۔

اگرچہ شادی کے مسئلے پر میری اور گھر والوں کی تلخ تر اور فیصلہ کن جنگ ہوئی مگر عورت کی حیثیت سے یقیناً یہ میری واحد جنگ نہیں تھی۔ میں نے جتنی بھی جنگیں لڑیں وہ صرف اور صرف اس لئے لڑنا پڑیں کہ میں عورت تھی۔ بعض اوقات گھر کا اچھا بھلا خوش کن ماحول مردانہ جہنم بھی بن جاتا ہے۔ کبھی یہ احساس مسرت کہ آپ میں لکھنے کی اہلیت آ گئی ہے چھپانا پڑتا ہے کہا سے بھی شرارت نہ سمجھ لیا جائے پھر اس کا دفاع کرنا پڑتا ہے۔ کسی نوجوان عورت کو اس کے پر پیچ مسائل میں سے نکلے کا مشورہ حاصل کرنے کے لئے کسی مرد سے اس کے دفتر میں ملاقات جنسی دست درازی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حتیٰ کہ جب یہ انکشاف ہو کہ عورتوں کی یونین کو در پردہ مرد چلا رہے ہیں تو پھر مردانہ جہنم کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

ہم نو بہن بھائی تھے، یہ ایک اوسط خاندان شمار ہوتا ہے پانچ لڑکے چار لڑکیاں ۔۔۔تین بھائی بڑے تھید و چھوٹے۔ایک بہن بڑی تھی اور دو چھوٹی۔ مجھے ہمیشہ میرے عورت ہونے کا احساس بھی دلایا گیا اور یہ بھی کہ میرے عورت ہونے کی وجہ سے خاندان کے ننگ و ناموس کو ہر وقت خطرہ لاحق ہے۔۔۔تاہم مجھے احساس ہوا کہ میرے والد مجھے بہت چاہتے ہیں۔وہ مجھے ہمیشہ ملکی کے نام سے پکارا کرتے تھے جس کا مطلب ہے ملکہ۔وہ مجھ سے شعر سنانے کی فرمائش کرتے یا یہ کہتے کہ میں ملنے کے لئے آنے والوں کے سامنے ملکہ بن کر دکھاؤں۔انہوں نے پوری کوشش کی کہ ان کی بیٹیوں کی تعلیم بھی بیٹیوں کے برابر ہو۔جب میں بالغ ہوئی تب انہیں میری نقل و حرکت پر شبہ ہونے لگا۔ ہر چند انہوں نے نہ تو دمشق میں اور نہ ہی برطانیہ میں میرے تعلیم حاصل کرنے کی مخالفت کی مگر ہمارے درمیان اس بات پر خاموشی معاہدہ تھا کہ میں لڑکوں سے دوستی نہیں کروں گی۔

برطانیہ کے سفر پر مجھے الوداع کہتے ہوتے انہوں نے میرے کان میں کہا مجھے تم پر اعتماد ہے کہ تم وہاں وہ نہیں کروگی جو انگریز عورتیں کرتی ہیں (یعنی تمہارے بوائے فرینڈز نہیں ہوں گے)۔میں نے ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔لیکن اب جب میں اپنے والد کے بارے میں غور کرتی ہوں تو میرے ذہن میں ان کی کس قدر مختلف بلکہ متضاد تصویریں ابھرتی ہیں۔بچپن میں ایک بہت پیار کرنے والے میری تعلیم میں بڑی دلچسپی لینے والے باپ کی تصویر ابھرتی ہے۔پھر وہ ایک جابر آقا کی صورت میں ابھرتے ہیں۔ایک فطری سی بات یعنی میرے بلوغت نے میرے والد کے لئے یہ لازم کردیا کہ وہ میرے زندگی پر مکمل کنٹرول حاصل کرلیں۔جب مجھے خلیل سے محبت ہوئی تو میں نے والد کا انتہائی خوفناک روپ دیکھا۔وہ میرے ساتھ کیسا سلوک کرنے والے ہیں مجھ پر یہ بات ان دونوں منکشف ہوئی جب میں لندن میں تھی۔یہ صورت حال ڈراؤنے خوابوں کی سی تھی۔ہم **1979**ء میں والدین سے ملے تھے تب والد نے بڑی سختی سے مجھے شادی سے منع کردیا تھا۔پھر انہوں نے دھمکی بھرے خطوں کی بارش کردی۔ مجھے یاد ہے میں دو دو دن تک ان کے خط کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔پھر میری دوست جولی آجاتی اور خوشی خوشی خط اٹھا کر دیتی'' آہا خط گھر سے آیا ہے۔''میں اس کا شکریہ ادا کرتی اور خط لے کر ایک طرف رکھ دیتی مجھے سات سات دن تک اسے کھول کر پڑھنے کی ہمت نہ پڑتی۔کم از کم پورے ایک ہفتے کا عذاب برداشت کر کے صرف ایک خط پڑھنے کا حوصلہ ہوتا۔ان خطوں میں اکثر دھمکیاں ہو

MashalBooks.org

تیں کہ اگر میں نے خلیل سے ترک تعلق نہ کیا اور کہا نہ مانا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ میرے بھائی اور بہن خط لکھتے اور خدا کا واسطہ دیتے کہ میں اس شخص کو چھوڑ دوں کیونکہ میرے باپ نے میری چھوٹی بہن (ناہید) کو مار ڈالنے کی دھمکیاں دینا شروع کر دی تھیں کیونکہ ناہید میرے بہت قریب تھی۔ اس سے کہا جاتا کہ مجھے خلیل کو چھوڑنے پر راضی کریں ورنہ میری جگہ ناہید کو ختم کر دیا جائے گا۔۔۔ ناہید نے میری خاطر جو سختی برداشت کی اس کی دلجوئی کے لئے ہی میں نے اپنی بیٹی کا نام ناہید رکھ دیا۔

اور بات یوں بھی نہیں تھی۔ کہ برطانیہ میں میں نے اپنی ثقافتی زنجیروں سے آزادی حاصل کر لی تھی اور خلیل کو بوائے فرینڈ بنا لیا تھا۔ میری جس طور پر پرورش ہوئی تھی اس اعتبار سے میں کسی ایسے مرد کے ساتھ سونے کا تصور تک نہیں کر سکتی تھی جو میرا شوہر نہ ہو میں تو صرف اپنا شوہر منتخب کرنے کا حق چاہتی تھی۔

جب میں چھوٹی تھی اور جب کبھی گھر یا باہر والوں سے کسی بات پر ناراض ہو جاتی تو میں کاغذ پر کچھ لفظ لکھنا شروع کر دیتی تھی۔ جو کچھ میں لکھتی اسے محفوظ جگہ پر چھپا دیا کرتی کہ مجھے دھڑکہ رہتا کہ میرے والد اور بھائی اسے پسند نہیں کریں گے۔ ایسی تحریر کے بعد میرا بوجھ ہلکا سا ہو جاتا میں ایک طرح کی راحت محسوس کرتی۔ جب میں ہائی سکول میں پہنچی تو مجھے پتہ چلا کہ میں جو کچھ لکھتی تھی وہ اصل میں شاعری ہوتی تھی۔ اب میں شاعری کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے لگی تھی۔ جب یونیورسٹی پہنچی تو شاعری سے رشتہ اور گہرا ہو گیا۔ ایک تو اسے لئے کہ میں گھر سے دور تھی یعنی زیادہ آزادی بھی تھی اور شاعری لکھتے وقت پکڑے جانے کا خدشہ نہیں تھا دوسرے اس لئے کہ اب مجھے شاعری کا بہتر وقوف حاصل تھا۔ یونیورسٹی میں سال دوم میں میں نے شاعری کے مقابلے میں حصہ لیا اور پہلا انعام حاصل کر لیا۔ جب چھٹیوں میں میں گاؤں گئی تو میرے سکول کی سہیلیاں، دوست اور سکول کے اساتذہ مجھے ملنے آئے اور وہ نظم سننے کی فرمائش کی جس پر مجھے اول انعام ملا تھا۔ میرے نزدیک یہ کوئی قابل اعتراض فرمائش نہیں تھی۔ میں آدھی نظم سنا چکی تھی کہ میرا ایک بھائی دھڑ سے اندر آیا (ظاہر ہے کہ وہ کمرے کے باہر چھپ کر سن گن لے رہا تھا) میرے ہاتھ سے نظم چھینی اور والد کو آواز دی کہ آئیں دیکھیں ان کی صاحبزادی یونیورسٹی میں کیا کرتی رہی ہے۔ بلاشبہ یہ نظم یہ بھائیوں کے اخلاقی دوغلے پن کے بارے میں تھی کہ بھائی کس طرح بہنوں کے لئے الگ پیمانہ رکھتے ہیں اور اپنے لئے اس سے بالکل مختلف معیار رکھتے

ہیں۔ میرے بھائی نے کہا کہ یہ نظم دراصل اس کی ہجو ہے (جزوی طور پر بات صحیح بھی تھی) اس نے مہمانوں کے سامنے مجھے طعن وتشنیع کا نشانہ بنانا شروع کردیا میرے مہمان مجھے میرے ناراض والد اور مغلوب انعضب بھائی کے رحم وکرم پر چھوڑتے ہوئے ایک ایک کر کہ کھسک گئے۔ میرے کاغذ ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ میری قیمتی نظمیں کھڑکی سے باہر پھینک دی گئیں اور مجھے بری طرح مارا گیا مجھے تو یاد نہیں کی جسمانی طور پر مجھے کتنا پیٹا گیا تھا اور مجھے کتنی تکلیف ہوئی تھی تاہم مجھے یہ یاد ہے کہ اس سے میری بے حد بے عزتی ہوئی تھی میری چیخیں سن کر میری بھابھی بھاگی بھاگی آئی مجھے بھائی کے بازوؤں سے چھڑایا اور اسے کمرے سے باہر دھکیل دیا ۔پھر اس نے دروازہ بند کیا میری آنکھوں میں دیکھا اور کہا تم ان کی وحشت سے واقف ہو۔تم شاعری کرتی کیوں ہو تم جانتی ہو کہ تم لندن میں نہیں رہتیں تم سعوریہ میں ہو، مجھے دیکھو، میں نے کبھی شاعری نہیں لکھی اور نہ ہی میری بہنوں میں سے کسی نے یہ کام کیا ہے۔

میں نے چلا کر کہا آپ کا مطلب کیا ہے کیا کوئی کوشش کر کے شاعری کر سکتا ہے؟ جو بھائی مجھے نظم لکھنے پر مار رہا تھا کیا وہ ایک بھی نظم لکھ سکتا ہے۔۔۔۔۔میں چپ ہونے کی کوشش کر رہی تھی مگر آنسو بھی میری سوجے ہوئے خشک ہونٹوں پر لرز رہے تھے۔

''چپ چپ'' مجھے خاموش کرنے کے لئے اس نے کہا انہیں ایسی باتوں کا پتہ نہ چلے انہیں چیلنج بھی نہ کرو خودسر نہ بنو۔ میرا بھائی کمرے کے باہر کھڑا سب کچھ سن رہا تھا اس نے ٹھڈا مار کر دروازہ کھولا دوسرے لمحے وہ میرے سامنے ایک سیاہ ستون کی طرح کھڑا غصے سے کانپ اٹھا۔تم کبھی یونیورسٹی نہیں جاؤ گی غصے میں پاگل ہو کر وہ غرایا تم سمجھتی ہو کہ تم کوئی خاص چیز ہو۔ میں تمہیں دکھاؤں گا کہ تم کچھ بھی نہیں ہو؟ف

ہر چند میں یونیورسٹی سطح پر اپنی تعلیم مکمل کر چکی ہوں شاعری پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی لے لی ہے لیکن میں اب بھی اس واقعہ کے حوالے سے محسوس کرتی ہوں کہ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اس روز میرے اندر کا کوئی ٹکڑا چیر کر الگ کر دیا گیا تھا جو آج تک واپس اپنی جگہ پر بہم نہیں کر سکی۔

ایک سال یوں ہوا کہ میری ایک پوسٹ گریجوایٹ طالبہ کورس درمیان سے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں پریشان ہوگئی اور چاہا کہ اس کے اس طرح چلے جانے کی وجوہ پوچھوں، اس وجوہ کا علم ہوا تو مجھے صدمہ ہوا۔ جب اس کی سہیلیاں چلی گئیں تو اس نے قصہ شروع کیا''میں شادی شدہ